

تفہیم القرآن

بنی اسرائیل

(۳)

تو بار اذ حقیقی، رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمہاری کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہے۔ جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم دیکھا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر

لے اور پر کے سلسلہ بیان سے اس کا تعلق سمجھنے کے لیے اس رجوع کے ابتدائی مضمون پر پھر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُمیس اول روزہ آفریش سے اولاد آدم کے پیچھے پڑا ہوا ہے تاکہ اس کو آرزوؤں اور تمنائوں اور جھوٹے وعدوں کے دام میں پھانس کر راہ راست سے ہٹائے جائے اور یہ ثابت کر دے کہ وہ اُس بزرگی کا مستحق نہیں ہے جو اسے خدا نے عطا کی ہے۔ اس خطرے سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی بندگی پر ثابت قدم رہے اور ہدایت و اعانت کے لیے اُسی کی طرف رجوع کرے اور اسی کو اپنا دلیل و مدد بنو لے۔ اس کے سوا دوسری جو راہ بھی انسان اختیار کرے گا، شیطان کے پسندوں سے بچ سکے گا۔ اس تقریر سے یہ بات خود بخود دھل آئی کہ جو لوگ توحید کی دعوت کو رد کرتے ہیں اور شرک پر اصرار کیے جاتے ہیں وہ دراصل آپ ہی اپنی تباہی کے وجہ ہیں۔ اسی مناسبت سے یہاں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال کیا جا رہا ہے۔

یعنی اُن معاشی اور تمدنی اور علمی و فنی فوائد سے متنوع ہونے کی کوشش کہ جو بحری سفر سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ یعنی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری اصلی فطرت ایک خدا کے سوا کسی رب کو نہیں جانتی، اور تمہارے اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ شعور موجود ہے کہ نفع و نقصان کے حقیقی اختیارات کا مالک بس وہی ایک ہے۔ وہ نہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ جو اصل وقت و شگیری کا ہے اُس وقت تم کو ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا دستگیر نہیں سوجھتا؟

پہچا دیتا ہے تو تم اُس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکر ہے۔ اچھا، تو کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھر اڑا کر دے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ؟ اور کیا تمہیں اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا لے آئے اور تم کو ایسا کوئی نہ ملے جو اُس سے تمہارے اس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے؟ — یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی زری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور انہی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔ پھر خیال کرو اُس دن کا جب کہ ہم ہر انسانی کردہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ اس وقت جن لوگوں کو ان کا نامہ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا گیا وہ اپنا کارنامہ پڑھیں گے اور ان پر زور بردہ ظلم نہ ہوگا۔ اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔

ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تجھے فتنے میں ڈال کر اُس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے تاکہ تو ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ دے۔ اگر تو ایسا کرتا تو

یعنی یہ ایک بالکل کلی ہوئی حقیقت ہے کہ نوع انسانی کو زمین اور اس کی اشیاء پر یہ اقتدار کسی جن یا فرشتے یا سیارے نے نہیں عطا کیا ہے، نہ کسی دلی یا نبی نے اپنی نوع کو یہ اقتدار دلوایا ہے۔ یقیناً یہ اللہ ہی کی بخشش اور اس کا کام ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر حماقت اور جہالت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اس مرتبے پر فائز ہو کہ اللہ کے بجائے اس کی مخلوق کے آگے جھکے۔

تھ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز نیک لوگوں کو ان کا نامہ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائیگا اور وہ خوشی خوشی اسے دیکھیں گے، بلکہ دوسروں کو بھی دکھائیں گے۔ یہ ہے بد اعمال لوگ تو ان کا نامہ سیاہ ان کو بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اسے جتنے ہی میٹھے پیچھے چھپانے کی کوشش کریں گے سنا حفظ ہو سورہ الحاقہ آیت ۱۹-۲۸ اور سورہ الشقاق آیت ۱۲-۱۷۔

تھ یہ ان حالات کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے دس بارہ سال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے میں ربانی مسیحا پر

وہ تجھے اپنا دوست بنا لیتے۔ اور بعد نہ تھا کہ اگر ہم تجھے مضبوط نہ رکھتے تو تو ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتا لیکن اگر تو ایسا کرنا تو ہم تجھے دنیا میں بھی دہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تو کوئی مددگار نہ پاتا۔

اوریہ لوگ اس بات پر بھی تھے کہ یہ میں کہ تیرے قدم اس سرزمین سے اٹھاؤں اور تجھے یہاں سے نکال باہر کریں۔ لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تیرے بعد یہ خود وہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔

راقیہ شامیہؓ پیش آیا ہے تھے کفار مکہ کی یہ کوشش یہی کہ جس طرح بھی ہو آپ کو توحید کی اُس دعوت سے ہٹا دیں آپ پیش کر رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح آپ کو مجبور کر دیں کہ آپ ان کے شرک اور رسوم جاہلیت سے کچھ نہ کچھ مصالحت کریں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے آپ کو فتنے میں ڈالنے کی ہر کوشش کی۔ فریب بھی دیے، لالچ بھی دلائے، دھمکیاں بھی دیں، جھوٹے پروپیگنڈے کا طوفان بھی اٹھایا ظلم و ستم بھی کیا، معاشی دباؤ بھی ڈالا، معاشرتی متعلقہ بھی کیا، اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو کسی انسان کے غم کو شکست دینے کے لیے کیا جاسکتا تھا۔

لے اللہ تعالیٰ اس ساری روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرماتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر تم حق کو حق جان لینے کے بعد باطل سے کوئی سمجھوتہ کر لیتے تو یہ بگڑی ہوئی قوم تو ضرور تم سے خوش ہو جاتی، مگر خدا کا غضب تم پر ٹھہر اٹھتا اور تمہیں دنیا و آخرت، دونوں میں دہری مزادی جاتی۔ دوسرے یہ کہ انسان خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو خود اپنے بل بوتے پر باطل کے ان طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ یہ سر امر اللہ کا بخشنا ہوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کوئی سیلاب بلا آپ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

۷۷ یہ مریخ پیشین گوئی ہے جو اُس وقت تو صرف ایک دھمکی نظر آتی تھی، مگر دس گیارہ سال کے اندر ہی حرف بحرف سچی ثابت ہو گئی۔ اس صورت کے نزول پر ایک سال گزرا تھا کہ کفار مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور اس پر ۸ سال سے زیادہ نگزرے تھے کہ آپ فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمین عرب مشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی پھر جو بھی اس ملک میں رہا مسلمان بن کر رہا، مشرک بن کر وہاں نہ ٹھہر سکا۔

یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تجھ سے پہلے ہم نے بھیجا تھا، اور ہمارے طریق کار میں تیرے کوئی تغیر نہ پائے گا یہ نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو

یعنی سلسلے انبیاء کے ساتھ اللہ کا یہی معاملہ رہا ہے کہ جس قوم نے ان کو قتل یا جلاوطن کیا، پھر وہ زیادہ پر تک اپنی جگہ نہ ٹھہر سکی۔ پھر یا تو خدا کے عذاب نے اسے ہلاک کیا، یا کسی دشمن قوم کو اس پر مسلط کیا گیا، یا خود اسی نبی کے پیروں سے اس کو مغلوب کر دیا گیا۔

لے مشکلات و مصائب کے اس طوفان کا ذکر کرنے کے بعد فوراً ہی نماز قائم کرنے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ثابت قدمی حیران حالات میں ایک مومن کو درکار ہے اقامت صلوٰۃ سے حاصل ہوتی ہے۔

لے زوال آفتاب ہم نے دلوک الشمس کا ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ و تابعین نے دلوک سے مراد غروب بھی لیا ہے، لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد آفتاب کا نصف النہار سے ڈھل جانا ہے حضرت عمر، ابن عمر، انس بن مالک، ابو بزنہ الاسلمی، حسن بصری، شعبی، عطاء، مجاہد، اور ایک روایت کی رو سے ابن عباس بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق سے بھی یہی قول مروی ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دلوک شمس کی یہی تشریح منقول ہے، اگرچہ ان کی سند کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ لے غسق الذیل بعض کے نزدیک رات کا پوری طرح تاریک ہو جانا ہے، اور بعض اس سے نصف شب مراد لیتے ہیں۔ اگر پہلا قول تسلیم کیا جائے تو اس سے عشا کا اول وقت مراد ہوگا، اور اگر دوسرا قول صحیح مانا جائے تو پھر یہ اشارہ عشا کے آخر وقت کی طرف ہے۔

لے فجر کے قرآن سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآن مجید میں نماز کے لیے کہیں تو صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کہیں اس کے مختلف اجزاء میں سے کسی جز کا نام لے کر پوری نماز مراد لی گئی ہے، مثلاً تسبیح، حمد، ذکر، قیام، تہجد، رکوع، سجود وغیرہ۔ اسی طرح یہاں فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا مطلب محض قرآن پڑھنا نہیں بلکہ نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس طریقہ سے قرآن مجید نے ضمایہ اشارہ کر دیا ہے کہ نماز میں اجزاء و باتیں ہیں

کیونکہ قرآن مجید مشہور ہے۔ اور رات کو عجب پڑھ، یہ تیرے

رقبہ عاشیہ ۳۷ سے مرکب ہوئی چاہیے۔ اور انہی اشارات کی منبائی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی وہ ہیئت مقرر فرمائی جو مسلمانوں میں رائج ہے۔

قرآن مجید کے مشہور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے گواہ بنتے ہیں، جیسا کہ احادیث میں تصریح بیان ہوا ہے۔ اگرچہ فرشتے ہر نماز اور ہر نیکی کے گواہ ہیں، لیکن جب خاص طور پر نماز مجرب کی قرأت پر ان کی گواہی کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی نمازیں طویل قرأت کرنے کا طریقہ اختیار فرمایا اور اسی کی پیروی صحابہ کرام نے کی اور بعد کے ائمہ نے اسے مستحب قرار دیا۔ لہذا اس آیت میں مجلایا بتایا گیا ہے کہ جو وقت نماز، جو محل نماز، جو موضع پر فرض کی گئی تھی، اس کے اوقات کی تنظیم کس طرح کی جائے۔ حکم ہوا کہ ایک نماز تو طلوع آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے، اور باقی چاند نمازیں زوال آفتاب کے بعد سے ظہر تک پڑھی جائیں۔ پھر اس حکم کی تشریح کے لیے جبریل علیہ السلام بھیجے گئے جنہوں نے نماز کے ٹھیک ٹھیک اوقات کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ چنانچہ ابو داؤد اور ترمذی میں ابن عباس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جبریل نے دو مرتبہ مجھ کو بیت اللہ کے قریب نماز پڑھائی۔ پہلے دن ظہر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ

سورج ابھی دھلا ہی تھا اور سایہ ایک جوتی کے تنے سے زیادہ دراز نہ تھا، پھر عصر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے اپنے قدم کے برابر تھا، پھر مغرب کی نماز ٹھیک اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ ۱۱ روزہ انتظار کرتا ہے، پھر عشا کی نماز شفق غائب ہوتے ہی پڑھا دی، اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن انہوں نے ظہر کی نماز مجھے اس وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قدم کے برابر تھا، اور عصر کی نماز اس وقت جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قدم سے دو گنا ہو گیا، اور مغرب کی نماز اس وقت جبکہ روزہ دار روزہ انتظار کرتا ہے، اور عشا کی نماز ایک تہائی رات گزر جانے پر، اور فجر کی نماز ابھی طرح روٹنی چل جانے پر پھر جبریل نے پلٹ کر مجھ سے کہا کہ اُسے محمد ایسی اوقات انبیاء کے نماز پڑھنے کے ہیں، اور نمازوں کے صحیح اوقات ان دونوں وقتوں کے درمیان ہیں۔ یعنی پہلے دن ہر وقت کی ابتدا اور دوسرے دن ہر وقت کی انتہا بتائی گئی ہے اور ہر وقت کی نماز (باقی صفحہ ۳۸ پر)

(تغیہ ماثرہ ۳۷) ان دونوں کے درمیان ادا ہونی چاہیے، -

قرآن مجید میں خود بھی نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف مختلف مواقع پر اشارے کیے گئے ہیں چنانچہ سورہ بروج فرمایا:
 اَوْفِرِ الصَّلَاةَ طَرَفِي الشَّهَائِرِ وَرُفَا
 نماز قائم کر دن کے دونوں کناروں پر یعنی فجر اور
 مَغْرِبِ، اور کچھ اِت گزرنے پر یعنی عشا،
 رُكُوع ۱۰

اور سورہ طہ میں ارشاد ہوا :-

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ
 اور اپنے رب کی حمد کی تسبیح کر طلوع آفتاب
 پھلے فجر، اور مغرب آفتاب سے پہلے عصر، اور رات کے اذان
 میں پھر تسبیح کر عشا، اور دن کے دونوں طرف یعنی
 صبح اور مغرب
 رُكُوع ۸

پھر سورہ بوم میں ارشاد ہوا :-

فَسَبِّحْ لِلَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ
 پس اللہ کی تسبیح کرو جبکہ تم شام کرتے ہو اور مغرب، اور صبح
 صبح کرتے ہو اور فجر، اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں میں اور زمین
 میں۔ اور اس کی تسبیح کرو دن کے آخری حصے میں عصر اور
 جبکہ تم صبح کرتے ہو (ظہر)
 رُكُوع ۱۲

نماز کے اوقات کا یہ نظام مقرر کرنے میں جو مصلحتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں ان میں سے ایک اہم مصلحت یہ بھی ہے
 کہ آفتاب پرستوں کے اوقات عبادت سے اجتناب کیا جائے۔ آفتاب ہر زمانے میں مشرکین کا سب سے بڑا، یا
 بہت بڑا معبود رہا ہے اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات خاص طور پر ان کے اوقات عبادت تھے ہیں، اس لیے
 ان اوقات میں تو نماز پڑھنا حرام کر دیا گیا اس کے علاوہ آفتاب کی پریش زیادہ تر اس کے عروج کے اوقات میں کی
 جاتی رہی ہے، لہذا اسلام میں حکم دیا گیا کہ تم دن کی نمازیں نوافل آفتاب کے بعد یعنی شروع کرو اور صبح کی نماز طلوع آفتاب
 سے پہلے پڑھ لیا کرو۔ اس مصلحت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے (باقی صفحہ ۳۷ پر)

اور دعا کہ کہ پروردگار مجھ کو جہاں بھی توے جاسچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں
(تفسیر ماشیہ ص ۳۲) چنانچہ ایک حدیث میں حضرت عمرو بن عبسہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سے نماز کے اوقات دریافت کیے تو آپ نے فرمایا:-

صل صلوۃ الصبح ثم اقص عن الصلوۃ
صبح کی نماز پڑھو اور جب سورج نکلنے لگے تو نماز
حین تطلع الشمس حتی ترتفع فانها
سے رک جاؤ۔ یہاں تک کہ سورج بلند ہو جائے۔
تطلع حین تطلع بین قرنی الشیطان
کیونکہ سورج جب نکلتا ہے تو شیطان کے سینگوں
وحینئذ یسجد لهما الکفار
کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کفار اس کو
سجدہ کرتے ہیں۔

پھر آپ نے عصر کی نماز کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:
ثم اقص عن الصلوۃ حتی تغرب
پھر نماز سے رک جاؤ۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو
الشمس فانها تغرب بین قرنی
جائے کیونکہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان
الشیطان وحینئذ یسجد لهما
غروب ہوتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ
الکفار (رواہ مسلم) کرتے ہیں۔

اس حدیث میں سورج کا شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع اور غروب ہونا ایک استعارہ ہے۔ یہ تصور
دلانے کے لیے کہ شیطان اس کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات کو لوگوں کے لیے ایک فتنہ عظیم بنا دیتا ہے
گویا جب لوگ اس کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھ کر سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیطان اسے اپنے سر پر
لیے ہوئے آیا ہے اور سر ہی پر لیے جا رہا ہے۔ اس استعارے کی گہرہ حضور نے خود اپنے اس فقرے میں کھول دی
ہے کہ ”اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔“

۱۔ (حاشیہ متعلقہ ص ۳۲) تہجد کے معنی میں نیند توڑ کر اٹھنے کے پس رات کے وقت تہجد کرنے کا مطلب یہ ہے
کہ رات کا ایک حصہ سونے کے بعد پھر اٹھ کر نماز پڑھی جائے۔

۲۔ (حاشیہ متعلقہ ص ۳۸) نفل کے معنی میں فرض سے زائد نماز خود بخود یا اشارہ کل آیا کہ وہ پانچ نمازیں جن کے اوقات

سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے اقتدار حکومت کو میرا مددگار بنا۔

راحشیہ ۱۷ متعلقہ ص ۳۲ یعنی دنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے جہاں تم محمود خلائق ہو کر رہو، ہر طرف سے تم پر مدح و ستائش کی بارش ہو، اور تمہاری ہستی ایک قابل تعریف ہستی بن کر رہے۔ آج تمہارے مخالفین تمہاری تواضع گالیوں اور ملامتوں سے کرسپے ہیں اور ملک جہر میں تم کو بدنام کرنے کے لیے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔ مگر وہ وقت دو نہیں ہے جبکہ دنیا تمہاری تعریفوں سے گوج اٹھے گی اور آخرت میں تم ساری خلق کے حضور ہو کر رہو گے۔ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبہ محمودیت کا ایک حصہ ہے۔

لے اس دعا کی تلقین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا وقت اب بالکل قریب آگیا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ تمہاری دعا یہ ہونی چاہیے کہ صداقت کا دامن کسی حال میں تم سے نہ چھوٹے، جہاں سے بھی نکل صداقت کی خاطر نکلنا اور جہاں بھی جاؤ صداقت کے ساتھ جاؤ۔

۱۷ یعنی یا تو مجھے خود حکومت دے یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنادے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فوج و جیش اور معاشی کے اس سیلاب کو روک سکوں۔ اور میرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری اور ثناء دہ نے کی ہے، اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل نقاد مفسرین نے اختیار کیا ہے، اور اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کرتی ہے کہ إِنْ اللّٰهُ كَيَّرَنِيْ بِالنَّاسِ مَا لَا يَزِيْغُ بِالْقُرْآنِ، یعنی اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے اُن چیزوں کا سبب اب کر دیتا ہے جن کا سبب قرآن سے نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف و غلط فہم کے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے پھر جبکہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجر لے لینا اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہوتا ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ یا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہو تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔

اور اعلان کر دے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔

ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ ناخصل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔ انسان کا حال یہ

لے یہ اعلان اس وقت کیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کم چھوڑ کر حبش میں پناہ گزین تھی، اور باقی مسلمان سخت بیکسی و مظلومی کی حالت میں مکہ اور اطراف مکہ میں زندگی بسر کر رہے تھے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہر وقت خطرے میں تھی۔ اس وقت بظاہر باطل ہی کا غلبہ تھا اور غلبہ حق کے آثار کہیں دوردور نظر نہ آتے تھے مگر اسی حالت میں نبی کو حکم دے دیا گیا کہ تم صاف صاف ان باطل پرستوں کو سناؤ کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ ایسے وقت میں یہ عجیب اعلان لوگوں کو محض زبان کا پھاگ محسوس ہوا اور انہوں نے اسے ٹھٹھوں میں اٹا دیا۔ مگر اس پر تو برس ہی گزرے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی شہر مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپ نے کعبے میں جا کر اس باطل کو مٹا دیا جو تین سو ساٹھ برسوں کی صورت میں وہاں سجا رکھا تھا۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے دن حضور کعبے کے تین پیرزب لگا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔ جلاء الحق و ما يبدي الباطل و ما يعيد۔

ملے یعنی جو لوگ اس قرآن کو اپنا رہنما اور اپنے لیے کتاب آئین مان لیں ان کے لیے تو یہ خدا کی رحمت اور ان کے تمام ذہنی، نفسانی، اخلاقی اور تمدنی امراض کا علاج ہے، مگر جو ظالم اسے روک کے اور اس کی رہنمائی سے منہ موڑ کر اپنے اوپر باطل ظلم کریں ان کو یہ قرآن اس حالت پر بھی نہیں رہنے دیتا جس پر وہ اس کے نزول سے یا اس کے جاننے سے پہلے تھے، بلکہ یہ انہیں اٹھا اس سے زیادہ خسارے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ جب تک قرآن آیا نہ تھا، یا جب تک وہ اس سے واقف نہ ہوئے تھے، ان کا خسارہ محض جہالت کا تھا۔ تھا مگر جب قرآن ان کے سامنے آگیا اور اس نے حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دیا تو ان پر خدا کی محبت تمام ہو گئی۔ اب اگر وہ اسے روک کر اسے گمراہی پر اصرار کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جاہل نہیں بلکہ ظالم اور باطل پرست اور حق سے نفور ہیں۔ اب ان کی حیثیت وہ ہے جو زہر اور ترياق، دونوں کو دیکھ کر باقی سب

کہ جب ہم اس کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ انہیں ٹھنڈا اور پیچھا موڑ لیتا ہے اور جب ذرا مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس ہونے لگتا ہے۔ اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ ”ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے، اب یہ تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ سیدھی راہ پر کون ہے۔“

یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو ”یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔“ اور اے محمد، ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں

۳۸۱ رقیہ حاشیہ ۳۸۱) زہر انتخاب کرنے والے کی ہوتی ہے۔ اب اپنی گمراہی کے وہ پورے ذمہ دار اور ہر گناہ جو اس کے بعد وہ کریں اس کی پوری سزا کے مستحق ہیں۔ یہ خسارہ جہالت کا نہیں بلکہ شرارت کا خسارہ ہے جسے جہالت کے خسارے سے بڑھ کر ہی ہونا چاہیے۔

۱۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں روح سے مراد جان ہے، یعنی لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعج حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے لیکن ہمیں یہ معنی تسلیم کرنے میں سخت تامل ہے، اس لیے کہ یہ معنی صرف اُس صورت میں ہیے جاسکتے ہیں جبکہ سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے اور سلسلہ کلام سے بالکل الگ کر کے اس آیت کو ایک منفرد جملے کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ ورنہ اگر سلسلہ کلام میں رکھ کر دیکھا جائے تو روح کو جان کے معنی میں لینے کے بعد عبارت میں سخت بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور اس امر کی کوئی معقول وجہ سمجھیں نہیں آتی کہ جہاں پہلے تین آیتوں میں قرآن کے نسخہ شفا ہونے اور منکرین قرآن کے ظالم اور کافر نعمت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور جہاں بعد کی آیتوں میں پھر قرآن کے کلام الہی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، وہاں آخر کس مناسبت سے یہ مضمون آگیا کہ جانداروں میں جان خدا کے حکم سے آتی ہے؟

۲۔ ربط عبارت کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد ”وحی“ یا وحی لانے والا فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر کین کا سوال دراصل یہ تھا کہ یہ قرآن تم کہاں سے لاتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد، تم سے یہ لوگ ”روح“ یعنی ماخذ قرآن، یا ذریعہ حصول قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ انہیں بتا دو کہ یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے اتنا کم بہرہ پایا ہے کہ تم انسانی رہائی سے

جو ہم نے وحی کے ذریعہ سے تم کو عطا کیا ہے پھر تم ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ پاؤ گے جو اسے واپس دلا سکے۔ یہ تو جو کچھ تمہیں ملا ہے تمہارے رب کی رحمت سے ملا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے۔ کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن عظیم (تفسیر تاشیخ ص ۳۸۲) ساخت کے کلام اور وحی ربانی کے ذریعہ سے نازل ہونے والے کلام کا فرق نہیں سمجھتے اور اس کلام پر شبہ کرتے ہو کہ اسے کوئی انسان گھڑ رہا ہے۔

تفسیر نہ صرف اس لحاظ سے قابل تریخ ہے کہ تقریر ماضی اور تقریر بالبعد کے ساتھ آیت کا ربط اسی تفسیر کا متقاضی ہے، بلکہ خود قرآن مجید میں بھی دوسرے مقامات پر یہ مضمون قریب قریب انہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے چنانچہ سورہ مؤمنین میں ارشاد ہوا ہے یَلْقِیَ الْوَحْیَ مِنْ أَمْرِهِ عَلٰی مَنْ كَشَّاهُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ۔ وہ اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کے دن سے آگاہ کر دے؟ اور سورہ شوریٰ میں فرمایا وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحَنَا مِنْ أَمْرِ نَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِنْبِیَاءُ اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح اپنے حکم سے بھیجی تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے؟

سلف میں سے ابن عباس، قتادہ اور حسن بصری رحمہم اللہ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو قتادہ کے حوالہ سے ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے، مگر عجیب بات لکھی ہے کہ ابن عباس اس خیالی کو چھپا کر بیان کرتے تھے۔ اور صاحب روح المعانی حسن اور قتادہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ”روح سے مراد جبرائیل ہیں اور سوال دراصل یہ تھا کہ وہ کیسے نازل ہوتے ہیں اور کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی کا اقتاد ہوتا؟“ لے خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر مقصود دراصل کفار کو سنانا ہے جو قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہوا یا کسی انسان کا درپردہ سکھایا ہوا کلام کہتے تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ یہ کلام پیغمبر نے نہیں گھڑا بلکہ ہم نے عطا کیا ہے اور اگر ہم اسے چھپیں میں تو نہ پیغمبر کی یہ طاقت ہے کہ وہ ایسا کلام تصنیف کر کے لاسکے اور نہ کوئی دوسری طاقت ایسی ہے جو اس کو ایسی معجزانہ کتاب پیش کرنے کے قابل بنا سکے۔

کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

لے یہ چیلنج اس سے پہلے قرآن مجید میں تین مقامات پر گزر چکا ہے۔ سورہ بقرہ (دکوع ۲)۔ سورہ یونس (دکوع ۳۴) اور سورہ مود (دکوع ۲)۔ آگے سورہ طور (دکوع ۱۲) میں بھی یہی مضمون آ رہا ہے۔ ان سب مقامات پر یہ بات کفار کے اس الزام کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ قرآن تعریف کر لیا ہے اور خواہ مخواہ وہ اسے خدا کا کلام بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مزید برآں سورہ یونس (دکوع ۲) میں اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے بھی فرمایا گیا کہ تَلَّوْا مَا تُلُوْنَ عَلَيْهِمْ وَلَا اِذْ مَرُّوْا بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی اے محمد، ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں سناؤں تو میں ہرگز نہ سنا سکتا تھا بلکہ تمہیں اس کی خبر بھی نہ دے سکتا تھا۔ آخر میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ اس طرح ان آیات میں قرآن کے کلام الہی ہونے کی تین دلیلیں پیش کی گئی ہیں:-

ایک یہ کہ یہ قرآن انہی زبان، اسلوب بیان، طرز استدلال، مضامین، مباحث، تعلیمات اور انجاء غیب کے لحاظ سے ایسی بے مثل کتاب ہے کہ ایک انسان تو دور کنار، تمام انسان مل کر بھی اس طرح کی کتاب تصنیف نہیں کھتے۔ بلکہ اگر وہ جن بھی، جنہیں مشرکین نے اپنا معبود بنا رکھا ہے، اور جن کی معبودیت پر یہ کتاب علانیہ ضرب لگا رہی ہے، منکرین قرآن کی مدد پر کھٹے ہو جائیں تو وہ ان کو اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن کے پائے کی کتاب تصنیف کر کے اس چیلنج کو دے سکیں۔

دوسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے یکایک تمہارے درمیان نمودار نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ اس قرآن کے نزول سے پہلے ہی، ۴۰ سال تمہارے درمیان رہ چکے ہیں، کیا وہ عموماً نبوت سے ایک دن پہلے بھی کبھی تم نے ان کی زبان سے اس طرز کا کلام، اور ان مسائل اور مضامین پر تشکل کلام سنا تھا؟ اگر نہیں سنا تھا اور یقیناً نہیں سنا تھا تو کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی شخص کی زبان، خیالات، معلومات اور طرز فکر و بیان میں یکایک ایسا بغیر واقع ہو سکتا ہے؟

تیسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں قرآن سنا کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ تمہارے وہاں رہتا رہتا ہے۔

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے۔ اور انہوں نے کہا ”ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو چھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔“ یا تیرے لیے کھجوریں اور انگوڑوں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اُس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرادے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھرن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ آتا کہ لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے محمد! ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟

ع

(فقیر حاشیہ ۳۸۲) در بیان ہی رہتے بہتے میں تم اُن کی زبان سے قرآن بھی سنتے ہو اور دوسری گفتگوئیں اور تقریریں بھی سنا کرتے ہو تو قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف سائل کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اُسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے بہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں احوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی فرشتا نقادیہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ یونس آیت ۶۶ کا حاشیہ)

لے معجزات کے مطالبے کا ایک جواب اس سے پہلے رکوع ۶ کی آیت وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّسَلِّ بِاٰیٰتِ میں گزر چکا ہے۔ اب یہاں اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے۔ اس مختصر سے جواب کی بارغت تعریف بالادب۔ مخاطبین کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر تم پیغمبر ہو تو ابھی زمین کی طرف ایک اشارہ کرو اور یکایک ایک چشمہ چھوٹ جائے، یا فوراً ایک بلبھاتا باغ پیدا ہو جائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔ آسمان کی طرف اشارہ کرو اور تمہارے جھٹلنے والوں پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جائے۔ ایک چونک مارو اور چشمہ زدن میں سونے کا ایک محل بن کر تیار ہو جائے۔ ایک آواز دو اور ہمارے سامنے خدا اور اس کے فرشتے فوراً آکھڑے ہوں اور باقی مشاہد

لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے اُن کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر اُن کے اسی قول نے کہ ”کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟“ ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور کسی فرشتے ہی کو اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

واقعیہ حاشیہ ۲۸۵: وہ شہادت دیں کہ ہم ہی نے محمد کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ کر جاؤ اور اللہ جیساں سے ایک خط ہمارے نام لکھو الا تو جسے ہم ہاتھ سے چھوئیں اور آنکھوں سے پڑھیں۔ ان لیے چوڑے مطالبوں کا پس یہ جواب دے کر چھوڑ دیا گیا کہ ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟ یعنی یہ تو فخر کیا میں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا کہ تم یہ مطالبے مجھ سے کرنے لگے؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میں قادر مطلق ہوں؟ میں نے کب کہا تھا کہ زمین و آسمان پر میری حکومت چل رہی ہے؟ میرا دعویٰ تو اوّل روز سے یہی تھا کہ میں خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمہیں جاننا چاہتا ہے تو میرے پیغام کو جانچو۔ ایمان لانا ہے تو اس پیغام کی صداقت و معقولیت دیکھ کر ایمان لاؤ۔ انکار کرنا ہے تو اس پیغام میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو ایک انسان ہونے کی حیثیت پر میری زندگی کو میرے افعال کو میرے کام کو دیکھو۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر تم مجھ سے یہ کیا مطالبہ کرنے لگے کہ زمین چھاڑو اور آسمان گراؤ؟ آخر پیغمبری کا ان کاموں سے کیا تعلق ہے؟

طبعی ہر زمانے کے جاہل لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جب کوئی رسول آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ کھانا ہے، پیتا ہے، چوری بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے، کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدت کے بعد اس کے عقیدت مندوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا، کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اس کو خدا بنایا، کسی نے اسے خدا کا بیٹا کہا، اور کسی نے کہا کہ خدا اس میں حلول کر گیا تھا۔ غرض بشریت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک معتاد ہی بنا رہا۔

لہذا یعنی پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اگر پیغام سنا دیا کرے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اسے انسانی احوال پر اس پیغام کے اصولوں کا انطباق دباتی ہے۔

اُسے محمدؐ، ان سے کہہ دو کہ میرے اوتھارے درمیان بس ایک اللہ کی گواہی کافی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو اُس کے بعد ایسے لوگوں کے لیے تو کوئی حامی و ناصر نہیں پاسکتا۔ ان لوگوں کو ہم قیامت کے روز اوندھے منہ کھینچ

(بقیہ جانشینہ ۳۳) کرنا چاہتے ہیں۔ اسے خود اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سمجھانی پڑتی ہیں جو اس کا پیغام سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے۔ اسے انکار اور مخالفت و فراموشی کرنے والوں کے مقابلے میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جبکہ انسانوں ہی میں کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ بس یہی کہتا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔ انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرنا اور پھر انسانی زندگی میں مسئلے الہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھادینا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔

یعنی جس طرح سے میں نہیں سمجھا رہا ہوں اور تمہاری اصلاح حال کے لیے کوشش کر رہا ہوں اسے بھی اللہ جانتا ہے، اور جو کچھ تم میری مخالفت میں کر رہے ہو اس کو بھی اللہ دیکھ رہا ہے۔ فیصلہ آخر کار اسی کو کرنا ہے، اس لیے بس اسی کا جانا اور دیکھنا کافی ہے۔

یعنی جس کی خدشات پسندی اور بٹ دھرمی کے سبب سے اللہ نے اس پر ہدایت کے دروازے بند کر دیے ہوں اور جسے اللہ ہی نے اُن گمراہیوں کی طرف دھکیل دیا ہو جس کی طرف وہ جانا چاہتا تھا، تو اب اور کون ہے جو اس کو راہِ راست پر لاسکے؟ جس شخص نے سچائی سے منہ موڑ کر جھوٹ پر مطمئن ہونا چاہا، اور جس کی اس خباثت کو دیکھ کر اللہ نے بھی اس کے لیے وہ اسباب فراہم کر دیئے جن سے سچائی کے خلاف اُس کی نفرت میں اور جھوٹ پر اُس کے اطمینان میں اور زیادہ اضافہ ہوتا چلا جائے، اسے آخر دنیا کی کوئی طاقت جھوٹ سے مخرب نہ رہا کرتی ہے،

لائیں گے، اندھے، گونگے اور بہرے۔ ان کا کھانا جہنم ہے جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دینگے۔ یہ بدلہ ہے ان کی اس حرکت کا کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کیا جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کر کیا جائیگا؟ کیا ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے کی ضرور قدرت رکھتا ہے؟ اس نے ان کے حشر کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا آنا یقینی ہے، مگر ظالموں کو اصرار ہے کہ وہ اس کا انکار ہی کریں گے۔

اے محمد، ان سے کہو، اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے، واقعی انسان بڑا ننگ دل واقع ہوا ہے۔ ہم نے موسیٰ کو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اب یہ تم خود

(تفسیر حاشیہ ۳۸) سچائی پر مطمئن کر سکتی ہے؟ اللہ کا یہ قاعدہ نہیں کہ جو خود کھینچنا چاہے اسے زبردستی ہدایت دے، اور کسی دوسری مستی میں یہ طاقت نہیں کہ لوگوں کے دل بدل دے۔

لے یعنی جیسے وہ دنیا میں بن کر رہے کہ نہ حق دیکھتے تھے، نہ حق سنتے تھے اور نہ حق بولتے تھے، ویسے ہی وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے۔

۱۷۔ یہ اشارہ اسی مضمون کی طرف ہے جو اس سے پہلے رکوع ۶ کی آیت در بک اعلمہ بمن فی السموات والارض میں گزر چکا ہے۔ مشرکین مکہ جن نفسیاتی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے تھے، ان میں سے ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس طرح انہیں آپ کا فضل و شرف ماننا پڑتا تھا، اور اپنے کسی معاصر اہم ختم کا فضل ملنے کے لیے انسان مشکل ہی سے آمادہ ہوا کرتا ہے۔ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی غیبی کا حال یہ ہے کہ کسی کے واقعی مرتبے کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے بھی ان کا دل دھکتا ہے، انہیں اگر کہیں خدا نے اپنے خزانے رحمت کی کنجیاں حوالے کر دی ہوتیں تو وہ کسی کو بھوٹی کوڑی بھی نہ دیتے۔

۱۸۔ واضح رہے کہ یہاں پھر قافلہ مکہ کو معجزات کے مطالبے کا جواب دیا گیا ہے، اور یہ تیسرا جواب ہے۔ کفار کہتے تھے کہ تم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم یہ اور یہ کام کہ کہ نہ دکھاؤ۔ جواب میں ان سے رہائی دے کر

بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا نا کہ اے موسیٰ، میں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ موسیٰ نے اس کے جواب میں کہا ”تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افزا رقیہ حاشیہ ۳۷) کہا جا رہا ہے کہ تم سے پہلے فرعون کو ایسے ہی صریح معجزات، ایک دو نہیں، پے در پے ۹ دکھائے گئے تھے، پھر نہیں معلوم ہے کہ جو زمانا چاہتا تھا اس نے انہیں دیکھ کر کیا کہا؟ اور یہ بھی خبر ہے کہ جب اس نے معجزات دیکھ کر بھی نبی کو ٹھکرایا تو اس کا کیا انجام ہوا؟

وہ نشانیاں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے سورہ اعراف میں گزر چکی ہیں یعنی غصا، جوار و باہن جاتا تھا، یثربیناء جو نعل سے نکلتے ہی سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا، جادوگروں کے جادو کو بربر عام شکست دینا، ایک اعلان کے مطابق سامے ملک میں تھوڑا سا ہوجانا، اور پھر کیے بعد دیگرے طوفان، ٹڈی دل، سرسریٹ، مینڈکوں اور نمن کی بلاؤں کا نازل ہونا۔

یہ وہی خطاب ہے جو مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ اسی سورت کے رکوع ۵ میں ان کا یہ قول گزر چکا ہے کہ اِنَّ تَتَّبِعُونَ الْاَدْرَجَالَ مَسْحُورًا (تم تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے چلے جا رہے ہو)۔ اب ان کو بتایا جا رہا ہے کہ ٹھیک اسی خطاب سے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو نوازا تھا۔

اس مقام پر ایک ضمنی مسئلہ اور بھی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ زمانہ حال میں منکرین حدیث نے احادیث پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ حدیث کی رو سے ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہو گیا تھا، حالانکہ قرآن کی رو سے کفار کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ جھوٹا الزام تھا کہ آپ ایک سحر زدہ آدمی ہیں۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ اس طرح راویان حدیث نے قرآن کی تکذیب اور کفار کے کی تصدیق کی ہے لیکن یہاں دیکھیے کہ بعینہ قرآن کی رو سے حضرت موسیٰ پر بھی فرعون کا یہ جھوٹا الزام تھا کہ آپ ایک سحر زدہ آدمی ہیں، اور پھر قرآن خود ہی سورہ ظہر میں کہتا ہے کہ فَاِذَا حَبَّالَهُمْ وَعَصِيَتْهُمْ يُحْيِي الْاَيُّوْمَ مِنْ سَحَرِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ نَفْسِهِ خِيْفَةٌ مُّوسٰىۙ بِعَنِىْ جَب جادوگروں نے اپنے ان پھر ھینکے تو کیا ایک ان کے جادو سے موسیٰ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کی لالٹیاں اور ریتیاں دوڑ رہی ہیں پس موسیٰ اپنے دل میں ڈر سا گیا۔ کیا یہ الفاظ صریح طور پر دلالت نہیں کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ اس وقت جادوور باقی نہ تھے؟

نشانیاں رب السموات والارض کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں، اور میرا خیال یہ ہے کہ اُسے (بقیہ حاشیہ ۳۹) سے متاثر ہو گئے تھے؛ اور کیا اس کے متعلق بھی منکرینِ حدیث یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ یہاں قرآن نے خود اپنی کذب اور فرعون کے جھوٹے الزام کی تصدیق کی ہے؟

در اصل اس طرح کے اقراضات اٹھانے والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کفار مکہ اور فرعون کس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ کو مسخ کرتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کسی دشمن نے جادو کر کے ان کو دیوانہ بنا دیا ہے اور اسی دیوانگی کے زیر اثر یہ نبوت کا دعویٰ کرنے اور ایک نرالا پیغام سناتے ہیں۔ قرآن ان کے اسی الزام کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔ ہا وقتی طور پر کسی شخص کے جسم یا کسی حاسہِ رحم کا جادو سے متاثر ہو جانا تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو پتھر مارنے سے چوٹ لگ جائے۔ اس چیز کا زکفرانے الزام لگایا تھا، نہ قرآن نے اس کی تردید کی، اور نہ اس طرح کے کسی وقتی تاثر سے نبی کے منصب پر کوئی حرف آتا ہے۔ نبی پر اگر نہ ہر کا اثر ہو سکتا تھا، نبی اگر نہ خمی ہو سکتا تھا، تو اس پر جادو کا اثر بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے منصبِ نبوت پر حرف آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ منصبِ نبوت میں اگر تا دوح ہو سکتی ہے تو یہ بات کہ نبی کے تو اسے عقلی و ذہنی جادو سے مغلوب ہو جائیں، حتیٰ کہ اس کا کام اور کلام سب جادو ہی کے زیر اثر ہونے لگے۔ بخلافین حق حضرت موسیٰ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی الزام لگاتے تھے اور اسی کی تردید قرآن نے کی ہے۔

یہ بات حضرت موسیٰ نے اس لیے فرمائی کہ کسی ملک پر نقطہ آجانا یا لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلے ہوئے علاقے میں مینڈکوں کا ایک بلا کی طرح لکنا، یا تمام ملک کے غلے کے گوداموں میں گھن لگ جانا، اور ایسے ہی دوسرے عام مصائب کسی جادوگر کے جادو، یا کسی انسانی طاقت کے کرب سے ہونا نہیں ہو سکتے۔ پھر جبکہ ہر بلا کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰ فرعون کو نوٹس دے دیتے تھے کہ اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو یہ بلا تیری سلطنت پر مسلط کی جائے گی، اور ٹھیک ان کے بیان کے مطابق وہی بلا پوری سلطنت پر نازل ہو جاتی تھی، تو اس صورت میں صرف ایک دیوانہ یا ایک سخت ہٹ و ہرم آدمی ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ ان بلاؤں کا نزول رب السموات والارض کے سوا کسی اور کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔

فرعون، تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے، آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اٹھا کر چھینکے، مگر ہم نے اُس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو، پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پورا ہو گا تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے۔

اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے، اور تمہیں ہم نے اس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ جو مان لے اسے، بشارت دے دو اور (جو نہ مانے اسے) تنبیہ کر دو۔ اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیک ٹھیک کر اسے لوگوں کو سناؤ، اور اسے ہم نے (مومن مومن سے) تدریجاً اتارا ہے۔ اُسے محمد، ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اسے مانو یا نہ مانو، جن لوگوں کو اس

لے یعنی میں تو ضرور شامت زدہ ہے تیرا ان خدائی نشانوں کو پے در پے دیکھنے کے بعد بھی اپنی ہٹ پر قائم رہنا صاف تباہی کا ہے کہ تیری شامت آگئی ہے۔

تو یہ ہے اصل غرض اس قصے کو بیان کرنے کی بشر کہیں مگر اس فکر میں تھے کہ مسلمانوں کو اور بنی صلی اللہ علیہ وسلم کو عزتیں عرب سے ناپید کر دیں۔ اس پر انہیں یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہی کچھ فرعون نے موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ساتھ کرنا چاہا تھا مگر ہوا یہ کہ فرعون اور اس کے ساتھی ناپید کر دیے گئے اور زمین پر موسیٰ اور پروان موسیٰ ہی بسائے گئے۔ اب اگر اسی روش پر چلو گے تو تباہی انجام اس سے کچھ بھی مختلف نہ ہو گا۔

سہم یعنی تہلے دے دے یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن کی تعلیمات کو جانچ کر حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اُن کو تم چٹے نکال کر ادیان لگا کر اور آسمان چھڑک کر کسی نہ کسی طرح مومن بنانے کو شش کرو، بلکہ تباہی کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے حق بات پیش کر دو اور پھر انہیں صاف صاف بتا دو کہ جو اسے مانے گا وہ اپنا ہی جلا کرے گا اور جو نہ مانے گا وہ برا انجام دیکھے گا۔

نکاحیہ مخالفین کے اس شبہ کا جواب ہے کہ اللہ میاں کو پیغام بھیجتا تھا تو پورا پیغام بیک وقت کیوں نہ بھیج دیا، یہ آخر ٹھیک ٹھیک تھوڑا پیغام کیوں بھیجا جا رہا ہے، کیا خدا کو بھی انسانوں کی طرح سوچ سوچ کر بات کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس شبہ کا مفصل جواب سورہ نحل رکوع ۴ کی ابتدائی آیتوں میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

سے پہلے علم دیا گیا ہے انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکاراٹھتے ہیں پاک سچ ہمارا رب اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا اور وہ منہ کے بل جوتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے من کران کا شروع اور بڑھ جاتا ہے۔ اسے نبیؐ، ان سے کہو، اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔ اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا بوجہ اختیار کرو۔ اور کہو تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بٹایا نیا، نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک کیا اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو۔ اور اس کی بڑائی بیان کرو اکمال درجے کی بڑائی مع

لہ یعنی وہ اہل کتاب جو آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے واقف ہیں ادا ان کے انداز کلام کو پہچانتے ہیں۔
 لہ یعنی قرآن کو سن کر وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ جس نبی کے آنے کا وعدہ پچھلے انبیاء کے صحیفوں میں کیا گیا تھا وہ آگیا۔
 لہ صالحین اہل کتاب کے اس رویے کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً آل عمران رکوع ۲۰، ۱۱۲۔ اور المائدہ رکوع ۱۱۔

لہ یہ جواب ہے مشرکین کے اس اعتراض کا کہ خالق کے لیے اللہ کا نام تو ہم نے سنا تھا، مگر یہ رحمان کا نام تم نے کہاں سے نکالا؟ ان کے ہاں چونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ نام رائج نہ تھا اس لیے وہ اس پر ناک بھوں چڑھتے تھے۔
 لہ ابن عباس کا بیان ہے کہ مکے میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے صحابہ نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور سب اوقات گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے۔ اس پر حکم ہوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو کہ کفار سن کر سوچیں کہ یہ اللہ ہے اور نہ اس قدر آہستہ پڑھو کہ تنہا اپنے ساتھی بھی نہ سن سکیں۔ یہ حکم صرف انہی حالات کے لیے تھا۔ مدینے میں جب حالات بدل گئے تو یہ حکم باقی نہ رہا البتہ جب کبھی مسلمانوں کو مکے کے حالات سے دوچار ہونا پڑے، انہیں اسی ہدایت کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

لہ اس فقرے میں ایک لطیف طنز ہے ان مشرکین کے عقائد پر جو مختلف یونانیوں اور بزرگ انسانوں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں نے اپنی خدائی کے مختلف شعبے یا اپنی سطنت کے مختلف علاقے ان کے انتظام میں رکھے ہیں اس بیہودہ عقیدے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی خدائی کا بار سنبھالنے سے عاجز ہے اس لیے وہ اپنے پشتیبان تلاش کر رہا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ اللہ عاجز نہیں ہے کہ اسے کچھ ڈپٹیوں اور مددگاروں کی حاجت ہو۔